ڈاکٹر عبدالحمید

سیاست کا ضابطۂ اخلاق

عالم سے عالم اور جاہل سے جاہل شہری تک، ہر شخص سیاست کے ضابطۂ اخلاق کے بارے میں اپنے اپنے خیالات رکھتا ہے اور اپنے اپنے شعور اور تجربے کی حد تک، اس میں نکتہ آفرینیاں کرتا رہتا ہے۔ یہاں ان فرائض کو صرف ایک فقرے میں بیان کر دینا کافی ہوگا۔ مملکت اس لیے ضروری ہے کہ شرفِ انسانی کی حفاظت کرے اور اس کی تکمیل میں مدد دے۔ مملکت کے کاروبار سیاست کے ذریعے طے پاتے ہیں۔ یعنی سیاست ایک عمل یا ایک طریق کار ہے جس سے غیر منظم شہریوں کی تنظیم ہوتی ہے حکومت کی تشکیل کی جاتی ہے اور مملکت کے فرائض انجام دیے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے ملکوں میں شہریوں کی آبادی کروڑوں تک پہنچتی ہے، اس لیے یہ تنظیم آسان نہیں! اس کو قابلِ عمل بنانے کے لیے چند بنیادی ضابطوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے اور یہی ضابطے اس مضمون میں اختصار کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

ہماری سیاست کا بنیادی نقطہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ہے۔ ایک صدی سے کچھ زیادہ عرصہ ہوا کہ ہمارے چھاپے خانوں میں چھپنے والی تمام کتابیں حمدِ خدا اور نعتِ محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے شروع ہوا کرتی تھیں۔ جوں جوں برطانوی دور گزرتا گیا، مغربی تعلیم پھیلتی گئی۔ یہ روایت آہستہ آہستہ معدوم ہوتی گئی۔ اکبر الٰہ آبادی نے اسی صورت کو دیکھتے ہوئے لکھا تھا:

ازیں لائبریری ہا مرا اکراہ نیست ہر کتابے را کہ بکشائیم بسم اللہ نیست

اقبال نے بھی کسی اور سلسلے میں کہا تھا:

حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری۔

اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا اقرار اور اس کا خوف ہماری سب سے بڑی معاشرتی قدر ہے۔ خدا کا خوف کسی فرد کے لیے سب سے بڑی پولیٹیکل کوالی فیکیشن (Qualification) ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ

سے ڈرتا ہے وہی دنیوی حکومت کا اہل ہے۔ یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ ہماری تاریخ کے اس عہد میں وزیروں مشیروں نے اکثر و بیشتر بادشاہوں کی انا کو تقویت پہنچانے کا خوشگوار فرض سنبھ رکھا تھا۔ لیکن جب کوئی فریادی کسی حاکم کے سامنے پیش کیا جاتا تو وہ اپنے دعوے کو خوف خد کی بات سے شروع کرتا۔ پاکستان کے دستور نے بھی سب سے پہلے اس حاکمیت کو تسلیم کیا ہے۔ وا یہ ہے کہ ہم اپنے اعمال و اقوال کے لیے سب سے پہلے اسی احکم الحاکمین کے سامنے جواب دہ ہیں۔ ہما کردار اور گفتار کا ریکارڈ ہر وقت قدرت کے ٹیپ ریکارڈوں اور کیمروں کی مدد سے تیار ہو رہتا ہے۔ مقررہ وقت پر، تمام و کمال، یہ ریکارڈ ہمارے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس کی موجو میں ہم اپنے ان خد و خال کو پہچان سکیں گے جو اکثر و بیشتر ہم اپنے آپ سے بھی چھپایا کرتے ہیں وہاں استغاثے اور صفائی کے گواہوں کی ضرورت نہ ہوگی۔ ہماری سیاسی زندگی کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھے۔ ذمہ داری قبول کرے اور ذمہ داری نبھائے۔ ہر انسان اللہ کے سامنے ذمہ دار ہے۔ نیز اپنے جیسے دوسرے انسانوں، بلکہ خود اپنے ضمیر کے آگے بھی جواب ہے۔ اوامر و نواہی، حقوق اللہ اور حقوق العباد کے اصول مجمل طور پر وحی الٰہی میں بیان کر دے گئے ہیں۔ ان کو سمجھنا، شریعت کی روشنی میں ان سے نتائج اخذ کرنا اور ان کو حالاتِ حاضرہ پر منطبق کرنا چاہیے۔ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تدبر، فکر اور محنت اس زندگی میں انسا کے سب سے کارآمد ہتھیار ہیں۔

اس صدی میں ہی یورپی ممالک میں بہت سے ایسے فلسفے اُبھرے ہیں، جو عقل و فہم سے دانستہ پر بُعد اختیار کرتے ہیں اور اسی عقل دشمنی کو اپنے لیے باعث امتیاز بتاتے ہیں۔ ان کے داعی نہ صر تشدد کی تلقین کرتے ہیں بلکہ وقت پر تشدّد کا بے محابا استعمال کرتے ہیں۔ ان نظریات کو عام طور "عقل دشمن" نظریات (anti-intellectual theories) بھی کہا گیا ہے۔ ان کے طریق کار میں قسم کے حربے شامل ہیں: اپنے فرائض میں کوتاہی، کام چھوڑ کر بیٹھ جانا، بے جواز مراعات طلب ک توڑ پھوڑ، گھیراؤ، جلاؤ۔ یہ تمام علامتیں ایک بیمار معاشرے کی خصوصیات ہیں۔ ایک تندرست توانا معاشرے کے افراد اپنے مسائل کو اصولوں کی روشنی میں افہام و تفہیم کے ذریعے طے کرتے ہیں بامقصد معاشرتی زندگی ہمیشہ اصولوں، بلکہ اخلاقی اصولوں کے تابع ہوتی ہے۔ سیاست بھی، معاش

کا ایک حصہ ہے۔ مسلمان مفکروں کے تمام افکار انہی ٹھوس حقیقتوں پر مبنی ہیں۔ لیکن بعض حضرات یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ اسلام کا سرے سے کوئی فلسفۂ سیاست ہی نہیں، قرآن کا کوئی سیاسی نظریہ نہیں۔ نہ ہی اسلامی تعلیم کسی اسلامی دستور کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ جو خیالات اسلام کے سیاسی فلسفے کے نام سے مروج ہیں، وہ اپنے اپنے مخصوص حالات کے ماتحت بعض فلسفیوں کی ذہنی اختراع ہیں۔ ان خیالات کا اظہار، دینیات کے ایک سابق استاد نے اپنی ایک حالیہ تصنیف میں کیا ہے۔ انھوں نے اپنے موقف کو اس نکتے تک پہنچایا ہے کہ مذہب اور سیاست دو جداگانہ چیزیں ہیں اور ایک دوسرے سے بے تعلق۔ نہ ہی ان کو ایک دوسرے کے دائرۂ کار میں دخل دینا چاہیے۔ تعجب تو اس بات پر ہے کہ یہ فلسفہ جو یورپ میں بے راہ روی اور مذہب بیزاری کی پیداوار ہے، اسی کو ایک گمراہ کن اور مبالغہ آمیز استدلال کی مدد سے ہمارے لیے قابل قبول بنایا جا رہا ہے۔ مغربی دنیا میں فلسفۂ سیاست اور فلسفۂ اخلاق کے باہمی رشتے کی تفصیل، اس مضمون کا موضوع نہیں۔ لیکن اس کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں یہ تعلق بہت گہرا اور قریبی تھا۔ میکیاولی نے اس روایت کو توڑا لیکن اس کے تین سو سال بعد تک بھی کسی نہ کسی تعلق میں، اخلاقی پابندیاں سیاست کو بے راہ روی سے بچاتی رہیں۔ نیچرل لا (Natural Law)، جس کا ترجمہ قانون فطرت کیا جائے گا اس زمانے کے مسلمہ سیاسی نظریات میں سرفہرست تھا۔ قدیم روما سے اس کی ابتدا ہوئی تھی۔ صدیوں تک اسے قبولِ عام کی سند حاصل رہی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس نظریے کو زوال آتا گیا۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آغاز میں اس کو بالکل ترک کر دیا گیا۔ گزشتہ سالوں میں امریکہ میں فلسفۂ سیاست کے بعض مفکروں نے اس کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے اس امید پر کہ شاید یہی لامذہب فلسفوں کے زہر کا تریاق بن سکے۔ معلوم نہیں کہ یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوتی ہے۔

انسانی مساوات کا اصول شرف انسانی کا پہلا تقاضا ہے۔ غلامی کے عنوان کے ماتحت عدمِ مساوات پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا:

من نہ دیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد۔

بظاہر دنیا کے بہت سے ملکوں نے مساوات کے اصول کو فراخ دلی سے قبول کر لیا ہے۔ ہر ملک کے تحریری آئین کا ایک باب عام طور پر شہری حقوق پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ حقوق ہر شہری کے لیے یکساں

ہوتے ہیں۔ فلسفۂ مساوات کو ایوانِ سیاست میں کونے کا پتھر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن آئین میں شمولیت کے بعد، مساوات، کسی معاشرے پر خود بخود نازل نہیں ہونے لگتی۔ اس کو واقعیت کا جامہ پہنانے کے لیے ہر وقت چوکس رہنے کی ضرورت ہوتی ہے اور مساوات کا ماحول قائم رکھنے کے لیے سارے معاشرے کو ہر وقت سرگرم عمل رہنا پڑتا ہے۔ قدیم الایام سے ہی اپنے دوستوں، ہمسایوں اور ہم کاروں کے مقابلے میں نفوق نہیں تو کم از کم برابری کی خواہش ہر دل میں موجزن رہی ہے۔ لیکن ماضی پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ تاریخ کے بہت سے ادوار میں مساوات نہیں بلکہ عدم مساوات کا دور دورہ رہا ہے۔

اسلام نے اپنے ابتدائی دور میں ایک ایسے معاشرے کی بنیاد رکھی تھی جس میں رنگ و نسل کے امتیاز، زر و مال کی ملکیت اور حسب و نسب کی وجاہت کو کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ یہاں بلال حبشی بھی پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اہلِ بیت کا ہم پلہ تھے۔ لیکن افسوس ہے، یہ فضا زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی۔ دوسرے معاشروں کی طرح مسلم معاشرہ بھی طبقوں میں بٹ گیا۔ تاہم یہ کوئی ہندوانہ ذات پات والی بات نہ تھی۔ صدیوں میں بھی اسے منو کے کاسٹ سسٹم کا درجہ حاصل نہ ہو سکا۔ مذہب کا اثر ہر دور میں ان تفرقوں کو مٹانے یا ان کی سنگینی کو کم کرنے میں مؤثر کردار ادا کرتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی تمام کمزوریوں کے باوصف اسلامی معاشروں میں مساوات کا تصور جان دار اور بامعنی رہا ہے۔ اور اب تک بھی اسلامی معاشروں کی گہرائیوں تک پہنچا ہوا ہے۔ مسلمانوں کا دامن "تسلیت" یا "ریس ازم" سے اتنا پاک ہے کہ شاید ہی کوئی دوسرا معاشرہ اس حیثیت سے مسلمانوں کا مقابلہ کر سکے۔

ماضی قریب کی تاریخ میں نسل پرستی نے مغربی تہذیب پر جو خونی دھبے لگائے ہیں، وہ ابھی تک تازہ ہیں۔ ان کا مختصر سا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔ سترھویں صدی کے امریکہ میں کسی شخص کا سیاہ فام ہونا ہی اس کی غلامی کی نشانی تھی۔ یہ بھی تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے کہ نیگرو امریکہ کی جنگِ آزادی میں بڑی بے جگری سے لڑے۔ لیکن انگلستان سے آزادی ملنے کے بعد ان کی حالت پہلے سے کہیں ابتر ہو گئی۔ نیگروز کے لیے پڑھنا لکھنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ کم خوراکی اور کم خوابی ان کا نوشتہ تقدیر بن گیا۔ ان سے اذیت ناک مشقت لی جاتی تھی۔ جو غلام اپنی کارکردگی سے اپنے آقاؤں کو خوش نہیں رکھ سکتے تھے ان کے لیے ہولناک سزائیں پہلے سے تیار ہوتی تھیں۔ نیگرو عورتوں کی عزت سے کھیلنا کوئی جرم نہ تھا۔ کوئی نیگرو اپنے باپ کا نام استعمال نہ کر سکتا تھا۔ معمولی معمولی خطا پر نیگروؤں کی تکا بوٹی کر دی جاتی

تھی۔ جو نیگرو کسی گورے کے خلاف عدالت میں گواہی دے یا گورے کو مخاطب کرتے وقت "مسٹر" کا لاحقہ استعمال نہ کرے۔ انتخابات میں ووٹ ڈالنے کی کوشش کرے۔ کسی گورے دکاندار کے ساتھ سودا سلف کی قیمت پر تکرار کرے یا سوسائٹی میں کوئی باعزت مقام حاصل کرنے کی تگ و دو میں ماخوذ ہو جائے، اس کے لیے ابد تک معافی کا دروازہ بند تھا۔ یہ بات عجیب تر ہے کہ ۱۸۶۵ء میں انسدادِ غلامی کے بعد بھی نیگرو کی حالت مسلسل ابتر ہوتی چلی گئی۔ نیگرو کو اپنے شہری حقوق سے محروم کرنے کے لیے جو قانونی ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے تھے، ان کا تذکرہ عبرت سے خالی نہ ہوگا لیکن اس موقع پر اس بحث کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ دنیا کی طعن و تشنیع سے اور دوسری سیاسی یا اخلاقی وجوہات سے امریکہ والے پچھلے تیس سال سے اس داخلی مسئلے کی طرف بھرپور توجہ دے رہے ہیں۔ اگر ملک پھر کسی وقت نسلی فسادات کی لپیٹ میں نہ آگیا تو مستقبل قریب میں حالات کے روبہ اصلاح ہونے کی توقع ہے۔

جنوبی افریقہ میں یہ جنون اب بھی روز افزوں ہے، یہاں کی حکومت اپنے مسلک کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے بہت سے حیلے بہانے گھڑتی رہتی ہے۔ اس کے نمائندوں کا موقف یہ ہے کہ ملک میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے مختلف گروہوں کی آبادیوں کو علاقہ بند کرنا ضروری ہے۔ اس نوعیت کا امن و امان جن طریقوں سے قائم کیا جاتا ہے، اس کی کچھ انوکھی مثالیں پیش خدمت ہیں: ایک کالا اور ایک گورا مل کر کسی ریسٹورنٹ میں چائے نہیں پی سکتے۔ اگر اجازت نامہ کے بغیر اس جرم کے مرتکب ہوں تو ان کے لیے جرمانہ تین سو پونڈ ہوگا یا وہ تین سال سزائے قید کے مستحق ٹھہریں گے۔ اگر کوئی کالا مزدور کسی گورے آجر کے تشدد کے خلاف احتجاجی ہڑتال کرے تو اسے پانچ سو پونڈ ہرجانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ جہاں جہاں کالے لوگوں کو سینما دیکھنے کی اجازت ہے، وہاں وہ گوروں کے برابر کرسیوں یا بنچوں پر بیٹھ کر پکچر نہیں دیکھ سکتے۔ کالے ٹیکسی ڈرائیوروں کو یہ اجازت نہیں کہ وہ گورے مسافروں کو اپنی ٹیکسیوں میں بٹھائیں۔ خفیہ پولیس سایہ کی طرح مشتبہ افراد کے پیچھے لگی رہتی ہے اور ان پر شدد کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ نسلی مقدمات میں جج علانیہ پولیس کی طرف داری کرتے ہیں۔ بعض قسم کے مشتبہ افراد اپنے معالج کے علاوہ کسی دوسرے شہری کے ساتھ گفتگو کرنے کے مجاز نہیں۔ ملزموں سے اقراری بیان لینے یا اپنے مطلب کی اطلاع حاصل کرنے کے لیے پولیس ان کو بجلی کے جھٹکے دیتی ہے۔ بعض دفعہ اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ملزموں کے سر پر ایک لمبی سی ٹوپی پہنا دی جاتی ہے اور

اس کے اندر دھواں بھر دیا جاتا ہے۔ جب اس تلخی سے شکار کا دم گھٹنے لگتا ہے تو وہ مطلوبہ اطلاع فی الفور اگل دیتا ہے۔ انسانی مساوات اور شرفِ انسانی کا تصور یونین آف ساؤتھ افریقہ میں سرے سے موجود ہی نہیں۔ اس کی تازہ ترین مثال گزشتہ ماہ جون کے ہولناک نسلی فسادات ہیں۔ جو حکومتیں جان بوجھ کر عدم مساوات کی حکمتِ عملی پر گامزن ہوتی ہیں، وہ اپنی سیاست کو ایک گندے جوہڑ میں تبدیل کر دیتی ہیں، جس کے تعفن سے شہریوں کا ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے۔ ان کی سوجھ بوجھ متاثر ہوتی ہے اور صحت مند سیاست کے پیدا ہونے کے تمام امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ ہر چند کہ مساوات انسانی سیاست کے ضابطۂ اخلاق کا دوسرا بڑا اصول ہے لیکن میدانِ سیاست کے بہت سے شاہسوار لفظاً تو نہیں لیکن عملاً اس سے انکار کرتے ہیں۔ پچھلی صدی میں برطانیہ کے دارالعوام (Commons) میں ایک معروف سیاست دان نے دوسرے ریفارم بل کی خواندگی کے دوران عوام کو "سوروں کا جمِ غفیر" (multitude) بتایا تھا۔ آج اتنے حوصلے والے اور جرأت مند لیڈر نہیں پائے جاتے جو کھلم کھلا مساواتِ انسانی کے مسئلے کی تحقیر و تضحیک کر سکیں۔ اس لیے وہ اس مسئلے کو "سائنسی بنیادوں" پر جھٹلانا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ دنیا میں کوئی دو شخص ہر حیثیت سے برابر نہیں ہوتے۔ نہ شکل و صورت میں، نہ اعضا و جوارح کی ساخت میں، نہ ذہانت اور فطانت کے لحاظ سے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ قدرت کا اصول انسانوں کی مساوات نہیں، بلکہ ان کی نابرابری ہے۔ نیز ان کے نزدیک مساواتِ انسانی کا تصور صرف ایک بے حقیقت خوش نما ڈھکوسلا ہے۔ بظاہر یہ خیالات قطعی طور پر بے بنیاد نہیں، لیکن جو لوگ مساواتِ انسانی کے مسئلے کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ ہیں وہ تمام انسانوں کو ہر حیثیت سے برابر رکھنے کے خواب نہیں دیکھتے۔ ان کا نقطۂ نظر یہی ہے کہ ہر قرینے کے معاشرے میں انسان کی قدر و قیمت انسان کی حیثیت سے پہچانی جائے اور ہر انسان کو ایسے مواقع حاصل ہوں جن سے استفادہ کرتے ہوئے وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو اجاگر کر سکے اور ان سے معاشرے کو فائدہ پہنچائے۔ اس لیے اس مسئلے کو مسئلہ برابری (Equality) کی بجائے مواقع کی برابری (Equality of opportunity) کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ ایسی مساوات پر عمل کرنے والا معاشرہ اپنے ہر فرد کی خداداد قابلیتوں کا پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس کی قوت کار اور ترقی کی رفتار، نامساوی معاشروں سے کہیں زیادہ ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی فضا صرف مملکت اپنی کوششوں سے پیدا کر سکتی ہے

اہل سیاست ہی ایک ایسی سیاست کو وجود میں لا سکتے ہیں جس کو امریکی مفکر لپسن (Lipson) نے "politics of equality" کا نام دیا ہے

اسلام میں عدل کا تصور ایک منفرد تصور ہے۔ جو دوسرے معاشروں میں اس شکل و صورت میں نہیں پایا جاتا۔ مسلمانوں کے ایک مکتب فکر نے تو اسے اصول دین میں شامل کیا ہے۔ ان کے ہاں اس کا نمبر توحید کے بعد آتا ہے۔ عصر حاضر کے ایک مشہور مفکر نے اس کی اہمیت کو یوں واضح کیا ہے:

"یہ کہنا غلط ہے کہ عدل اسلام کا ایک حصہ ہے۔ بات یوں ہے کہ عدل ہی اصل اسلام ہے۔"

روزمرہ کی زبان میں ہم عدل و انصاف کا محاورہ کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ عدل کا ترجمہ عام طور پر انصاف کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے معنی کے اعتبار سے عدل ایک وسیع تصور ہے اور اس کے تقاضے بہت دور رس ہیں۔ اگر عدل کی بجائے کوئی دوسرا لفظ اس کے قریبی معنی ادا کر سکتا ہے تو وہ "توازن" ہے جس کا مطلب ہے "افراط و تفریط سے پرہیز۔" ابن سینا نے لکھا ہے کہ عدل درمیانی راستہ ہے۔ اس کا تعلق فرد کے ساتھ ہے اور معاشرے کے ساتھ بھی۔ ہر مسلم معاشرے کا قانونی اور اخلاقی فرض ہے کہ عدل کے حصول کے لیے متواتر کوشاں رہے۔" یہی وجہ ہے کہ مسلمان فقہا نے عدل کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ قرآن کی دو آیات کا عام مفسرین نے یہ مفہوم لیا ہے کہ ہر سیاسی اور معاشرتی تنظیم عدل کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے وجود میں آتی ہے۔ حدیث میں عدل کو عبادت کی ایک مستحسن صورت قرار دیا گیا ہے۔ ابن سینا نے یہاں تک کہا ہے کہ عدل نوع انسانی کے بقا کا ضامن ہے۔ عدل کے بغیر دنیا کا نظام بگڑ جائے اور انسان غول بیابانی بن جائیں۔ فلسفی ابن المقفی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ رعایا صرف عادل حکومتوں کی اطاعت کی مکلف ہے، غیر عادل حکومتوں کی اطاعت کی مکلف نہیں۔

عدل کا نام قانون اور عدالتی کارروائی کے ضمن میں بھی لیا جاتا ہے۔ یہ صرف اس کا مجردی مفہوم ہے۔ لیکن اگر عدل کے مفہوم کو صرف یہیں تک ہی محدود کر دیا جائے تو ایک عادل معاشرے کے افراد کی انسانی خوبیوں کی نشاندہی بآسانی کی جا سکتی ہے۔ عادل انسان اسلامی مملکت کا مثالی شہری ہے۔ اسے بے داغ سیرت کا مالک ہونا چاہیے۔ اسلامی عدالتوں میں صرف اسی کی گواہی قبول کی جاتی تھی۔ اس حیثیت میں وہ شاہد عادل کہلاتا تھا۔ محکمہ قضا کے اعلیٰ عہدے داروں کے فیصلوں کی تفصیلات

میں جائیں تو معلوم ہوگا کہ اسلامی عدالتوں کے نزدیک شاہد عادل میں کیسی صفات ہونی چاہییں۔ مثلاً ایک قاضی کے متعلق بتایا گیا ہے کہ انھوں نے ایک ایسے گواہ کی شہادت کو نظرانداز کر دیا تھا جو اپنی مطلقہ بیوی کے نان نفقے کا معقول انتظام کرنے سے قاصر رہا تھا۔ ایک دوسرے قاضی کے بارے میں روایت ہے کہ انھوں نے اپنے ایک گہرے دوست کے شہادتی بیان کو بدیں وجہ ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ ایک موقع پر اس کے سر پر ایک کنیز کے عشق کا ایسا بھوت سوار تھا کہ اس نے اس کنیز کو حاصل کرنے کے لیے ایک کثیر رقم پانی کی طرح بہا ڈالی تھی۔ ایک اور معزز گواہ کے موقف کو عدالت نے اس بنا پر رد کر دیا تھا کہ اس نے کسی کلچرل شو میں ایک مغنیہ کے آرٹ کی داد دیتے ہوئے نہایت بھونڈے اور عامیانہ الفاظ استعمال کیے تھے۔ ان واقعات سے یہ بتانا مقصود ہے کہ عدل کا تصور کتنا ہمہ گیر ہے۔ اور اس کو متعین کرنے کے لیے کن کن باریکیوں میں جانا پڑتا ہے۔ عدل کا مقصد ایک متوازن معاشرے کی تعمیر ہے اور ظاہر ہے کہ ایک متوازن معاشرے کی تعمیر کے لیے خود متوازن دماغوں کی ضرورت ہے جو عدل کے تقاضوں سے آشنا ہوں اور ان پر پورے اترتے ہوں۔ امیرالمومنین جناب علی مرتضیٰ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ "مومن وہ ہے جو اپنے دشمن کے ساتھ بھی انصاف کرتا ہے۔"

سیاست کے ضابطۂ اخلاق پر گفتگو کرتے ہوئے، تعلیم کا ذکر نہ غیر ضروری ہے اور نہ بے مقصد۔ زمانۂ ماضی میں جن مفکروں نے فلسفۂ سیاست سے بحث کی ہے، انھوں نے التزام کے ساتھ کسی نہ کسی طرح کے نظامِ تعلیم کا خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسیات کی کلاسیکی کتابیں، تعلیم کے موضوع پر بھی کلاسیکی تصنیفات شمار کی جاتی ہیں۔ مغرب میں افلاطون سے لے کر روسو تک اور عالم اسلام میں ابنِ سینا اور ابنِ خلدون جیسے مفکروں نے علوم کی مختلف اقسام پر بات چیت کی ہے بلکہ تعلیم پر بھی سیر حاصل ابواب لکھے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان شیخ سعدی کا زمانہ ہے، ان کے اس مصرع نے کہ "عجب بے علم توان خدا را شناخت" ضرب المثل کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ چونکہ اسلامی سیاست، خدا آگاہ سیاست ہے۔ اس لیے علم کی اہمیت عیاں ہے۔ یہ بات بدیہی ہے کہ ہر پائدار سیاسی نظام صرف موزون تعلیمی نظام پر منحصر ہے۔ فرانس میں آزادی، مساوات اور انسانی برادری کے تصورات تعلیم کے ذریعے ہی نوجوانوں کے دلوں میں بٹھلائے جاتے ہیں۔ روس اور چین کی تعلیم پر گہرا اشتراکی رنگ چڑھا ہوا ہے۔ جرمنی میں ہٹلر کے دورِ اقتدار میں قوم کی عسکری ذہنیت کو بیدار کرنے کے لیے، پرائمری

سکولوں میں پڑھائی جانے والی حساب کی کتابوں کے گنتی اور اعداد کے حصوں میں بچوں کو بموں، گولیوں، شاہین گنوں کے سوالوں کی مدد سے گنتی کی مشق کرائی جاتی تھی۔ اگر فرعون بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنے کے بجائے اپنے ملک کا نظامِ تعلیم بدل دیتا تو ایک عظیم تاریخی عبرت بننے سے بچ جاتا۔ جو قومیں اپنی تاریخ کے کسی دور کو فراموش کر دینا چاہتی ہیں، اس کو نصابِ تعلیم سے خارج کر دیتی ہیں، مثلاً ایک عرصہ تک ترکی کی یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے تاریخ میں دورِ خلافت کا مطالعہ خارج از نصاب قرار دے دیا گیا تھا۔ اہلِ سیاست ملک کے نوجوانوں میں جس قسم کی سپرٹ پیدا کرنا چاہتے ہیں، مطابق تعلیمی نصاب مرتب کرواتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے بننے کے فوراً بعد ہی نظام کے ساتھ تجربوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ یہ ساری کوششیں رائگاں نہیں گئیں۔ ان سے سبق ملے ہیں۔ اب ہمارے اساتذہ اور نصاب بنانے والے اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں بخوبی آگاہ ہو چکے ہیں۔ چونکہ پاکستان، دنیا کے نقشے پر ایک اسلامی مملکت کی حیثیت سے ا اس کے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے نظامِ تعلیم کو ایک مخصوص ڈھب پر لانا مقصود تھا۔ آپ کبھی کبھی یہ شکایت سنتے ہوں گے کہ ہمارا نظامِ تعلیم اسلامی نہیں۔ یہ بات درست بھی ہے بھی۔ جہاں تک سکول کی تعلیم کا تعلق ہے۔ اس میں اسلامی عناصر کی کمی نہیں بلکہ فراوانی ہے۔ البتہ اور یونیورسٹیوں میں ابھی تک ضروری تبدیلیوں کا کما حقہٗ نفاذ نہیں کیا جا سکا۔ آج تک ہم نوجوان انہی کتابوں سے مستفید ہو رہے ہیں جو دراصل انگلستان اور امریکہ کی تعلیمی ضروریات رکھتے ہوئے لکھی گئی تھیں۔ اس سے ہمارے طلبا کو انگریزی اور امریکی نقطۂ نظر سے تو آگاہ ہے لیکن ان میں پاکستانی ذہنیت پیدا نہیں ہوتی۔ یہ کتابیں ان علوم سے تعلق رکھتی ہیں جنہ انسانیات یا معاشرتی علوم کہا جاتا ہے۔

ہماری قومی، روحانی اور ثقافتی روایات پر نظر ڈالی جائے تو تعلیم کی اہمیت اور بھی کھل کر آتی ہے۔ وحی ربانی کا نزول "اقرأ" سے شروع ہوا تھا۔ فخرِ موجودات، سرورِ کائنات صلی اللہ وسلم کی دو مشہور حدیثیں، جن میں طلبِ علم کو مومنین اور مومنات کے لیے فریضہ قرار دیا گیا ہے اور حصولِ علم کے لیے چین تک سفر اختیار کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے، عام مسلمانوں کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ خیر القرون میں دشمن کے جنگی قیدیوں کو جن شرائط پر آزاد کیا جاتا تھا ان میں سے ایک یہ بھی

تھی کہ وہ چند مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھادیں۔ خود قرآن نے جابجا اپنے پڑھنے والوں کو مشاہدہ، غور، فکر اور تدبر کی دعوت دی ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں نے علمی دنیا میں جو محیر العقول کارنامے انجام دیے وہ اسلام کی تعلیم کا نتیجہ تھے۔ مغربی مصنفین نے جہاں کہیں مسلمانوں کی عظمت کا بلا چون و چرا اعتراف کیا ہے وہ علمی میدان ہی ہے۔ ایجاد و اکتشاف کے اس دور میں علم کی اہمیت بدرجہا بڑھ گئی ہے۔ دنیا نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی ہے کہ کوئی قابل ذکر کارنامہ ٹھوس علمی بنیادوں کے بغیر انجام نہیں پاسکتا۔ وہی قومیں دنیا کی تعمیرِ نو کے دعوے کرتی ہیں جنھوں نے علوم و فنون کی بہت سی شاخوں میں بیش از بیش اضافے کیے ہیں۔ ان کی "خدائی فوجداری" کا انحصار ان کی علمی صلاحیت پر ہے۔ لیکن ہم ان کی شاطرانہ ذہنیت، ان کے مکر و دجل، ان کی تخریب کاری کی بے پناہ قوتوں سے زیادہ مرعوب ہیں اور ان کی سربلندی کی حقیقی بنیاد کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ساری بات کا ماحصل یہ ہے کہ بیرونی دنیا میں کسی قوم کا اثر و رسوخ اور اس کی عزت، اس کی علمی صلاحیت پر منحصر ہے۔ تاریخ نے بھی قوموں کی قدر و قیمت کا اندازہ ان کے تخلیقی کارناموں سے ہی لگایا ہے۔ یہ بات بھی یاد رہے کہ درستیٔ اخلاق سے بے اعتنائی برتنے والی تعلیم بے کار ہے۔ اگر بچوں کو سکولوں اور کالجوں میں صحیح تعلیم دی گئی ہے تو بہت سی اخلاقی تحریکوں پر خرچ ہونے والا وقت اور روپیہ بچ جائیں گے۔ مثلاً عریانی اور فحاشی جیسی خرابیوں کے خلاف محاذ قائم کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

مساوات کی اہمیت کا ذکر گزر چکا ہے۔ مساواتی معاشرہ، کم و بیش ہر اسلامی سوسائٹی کا منتہائے مقصود ہے۔ اس کی بنیاد مدرسے میں رکھی جاتی ہے۔ یہاں ہر طبقے کے بچے آتے ہیں، کالے، گورے، امیر غریب، کھلنڈرے، پڑھاکو، ذہین، غبی، شہری، دیہاتی، آجروں کے نور چشم، مزدوروں کے گھروں کے چراغ، چند سال اکٹھے رہنے سے یہ سب آپس میں گھل مل جاتے ہیں، ہر بچہ اپنے حقوق و فرائض کو سمجھنے لگتا ہے۔ مدرسہ یا کالج، ہر قسم کے افراد کو معاشرے میں جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کی کامیابی کا انحصار اسی بات پر ہے کہ وہ اس فرض کو کہاں تک ادا کرتا ہے۔ سیاست مدن کے ابتدائی اسباق یہیں ملتے ہیں۔ یہیں سے ملت کو زندہ رکھنے والی وحدتِ افکار پیدا ہوتی ہے۔

تعلیم اور سیاست کا تعلق کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قوموں کو بنانے اور بگاڑنے میں علم اور تعلیم فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ صرف ظاہری نظروں میں ملکوں کی قسمتوں کا فیصلہ سیاست

کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ لیکن ہر ترقی یافتہ ملک میں اہلِ سیاست اہلِ علم کے مشورے کے محتاج ہوتے ہیں۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کسی لمبے چوڑے استدلال کی ضرورت نہیں کہ اہلِ سیاست کے لیے خود بھی علم سے بے بہرہ ہونا بہت بڑے زیان کا باعث ہو سکتا ہے۔ فی الحال تمام ملکوں میں سیاست کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے ہیں، جو چاہے اس میدان میں داخل ہو کر قسمت آزمائی کر سکتا ہے۔ یہاں زمین دار، صنعت کار، ڈاکٹر، انجنیئر، ٹھیکیدار، سابق سرکاری ملازم، انشورنس ایجنٹ، وکیل پروفیسر، پیشہ ور لیڈر، غرضیکہ ہر طرح کا پختہ اور ناپختہ انسانی میٹریل ملتا ہے۔ کسی ملک نے بھی اہلِ سیاست کے لیے کوئی تعلیمی معیار مقرر نہیں کیا۔ یہ بات کسی لحاظ سے بھی تسلی بخش نہیں کہلا سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں، متواتر تجربے کے بعد، سیاست دان اپنی ٹریڈ یونین کے ذریعے اپنے پیشے کا ضابطۂ اخلاق مرتب کرتے ہوئے کم سواد اور کم نظر افراد کے لیے سیاست کے دروازے بند کر دیں اور اس بات پر اصرار کریں کہ سیاست کی وادی میں صرف وہی لوگ قدم رکھیں جو نہ صرف قرآن حدیث، فقہ، طبیعات، ریاضی، طب، فلکیات جیسے علوم پر گہری نظر رکھتے ہوں۔ بلکہ قوم کے تعلیمی مسائل میں بھی بھرپور دلچسپی لیتے ہوں۔ یہ دُور کی بات ہوگی۔ اسے خواب ہی سمجھ لیجیے۔ لیکن ایک نظریاتی مملکت کے لیے ان خطوط پر سوچ بچار کرنا لازمی ہے۔ غالباً اس تجویز کو افلاطونیت کا طعنہ دے کر رد کر دیا جائے گا۔ لیکن مسلمان مفکرین کے نزدیک حکمرانوں کا عالم ہونا نہایت ضروری ہے۔ اکثر علما کی رائے میں خلیفہ مجتہد بھی ہونا چاہیے۔ ان کے نزدیک مسلم معاشرے کا مثالی حکمران سکالر سٹیٹس مین (Scholar statesman) ہے۔ انھوں نے یہاں تک بھی کہا ہے کہ اگر حکومت کے لیے ایک فوجی اور ایک عالم کے درمیان انتخاب کرنا پڑے تو ترجیح ہمیشہ عالم کو دی جائے۔

ڈسپلن یعنی نظم و ضبط، اس سہ لفظی مانٹو کا ایک حصہ ہے جو بانیٔ مملکت نے پاکستان اور پاکستانیوں کے لیے تجویز کیا تھا۔ بظاہر یہ چھوٹا سا لفظ ہے جس کو ہر شخص بچپن میں رٹے ہوئے سبق کی طرح ہر جگہ دہرا سکتا ہے۔ اس لیے اس موضوع پر ایک اور درس دینا، شاید بے معنی جسارت ہو۔ لیکن ڈسپلن زندگی کے ان اٹل اصولوں میں سے ہے جو روزمرہ کی تکرار سے عام لوگوں کے نزدیک بے معنی تو ہو جاتا ہے لیکن اس کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ غور سے دیکھا جائے تو انسانی زندگی نظم و ترتیب سے عبارت ہے۔ جس شاعر نے زندگی کو "عناصر میں ظہورِ

ترتیب" سے تعبیر کیا تھا، اس نے ایک بہت بڑی حقیقت کی نشان دہی کی تھی۔ ہمارے ہاں نظم وضبط کا فقدان ایک روگ کی شکل اختیار کر گیا ہے اور یہی ہمارے سیاسی اور معاشرتی مصائب کی جڑ ہے۔ جس طرح کسی ریلوے ٹرین میں تھرڈ کلاس کے مسافر نظم وضبط کو غیر ضروری بوجھ خیال کرتے ہیں اور ہر موقع پر افراتفری کے بدترین نظارے پیش کرتے ہیں، اسی طرح کسی کسی وقت ہمارا سارے کا سارا معاشرہ تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ کا نقشہ بن جاتا ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ نظم وضبط کی بدولت تمام کام آسان ہو جاتے ہیں۔ کھیل کا میدان ہو، کالج آڈیٹوریم میں مباحثہ ہو، کلاس روم میں درس وتدریس کا سلسلہ ہو کسی چھوٹی یا بڑی دکان پر خرید و فروخت کا معاملہ ہو۔ ریلوے کے بکنگ آفس کے سامنے ٹکٹ خریدنے کی مہم ہو، ہر جگہ نظم وضبط کی برکت سے سارے مسائل کشیدگی اور تضییع اوقات کے بغیر خوش اسلوبی سے نپٹائے جا سکتے ہیں۔ نظم وضبط معاشرے کی شہ رگ یا لائف لائن ہے۔ دنیا کی تمام بڑی بڑی قومیں وہی ہیں جو اپنے معمولات میں یا تو نظم وضبط کی پابند ہوتی ہیں یا پابند بنا دی جاتی ہیں۔ علامہ اقبال جب مسولینی سے ملے تو دورانِ گفتگو انھوں نے بطورِ خاص اس بات کا ذکر کیا تھا کہ مسولینی کا اندازِ فکر اس لحاظ سے اسلامی فکر کے بہت قریب ہے کہ دونوں میں ڈسپلن کو یکساں اہمیت حاصل ہے۔ کسی قدر غلو کے ساتھ اسی تصور سے مرحوم عنایت اللہ خان مشرقی نے بہ تفصیل اپنی کتاب تذکرہ میں اطاعتِ امیر کے عنوان سے جا بجا بحث کی ہے۔ اگر ایک لمحے کے لیے اجتماعی زندگی سے قطع نظر کر کے افراد کی زندگیوں پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ بامقصد زندگی گزارنے کے لیے ہر فرد اپنے آپ کو کسی نہ کسی نظم وضبط کا پابند بناتا ہے۔ اگر وہ اپنے اوپر پابندیاں عائد نہیں کر سکتا تو وہ دنیا میں کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام دینے کی لیاقت نہیں رکھتا۔ ڈسپلن کی مدد سے نہ صرف افراد بلکہ اقوام بھی اپنی قوت کا صحیح استعمال کر سکتی ہیں۔ بے شک کسی قوم کے بہت سے افراد میں فرداً فرداً شجاعت، علم، خدا ترسی، ثروت اور سخاوت جیسی بے بہا خوبیاں موجود ہوں، لیکن نظم وضبط کے بغیر ان کا حقیقی فائدہ نہ فرد کو پہنچتا ہے نہ قوم کو۔ اس قسم کی بہت سی دوسری مثالوں سے واضح ہو جائے گا کہ روحانی اور معاشرتی فوائد کے علاوہ موجودہ مشینی دور میں ڈسپلن ایک بہت کارآمد ہتھیار ہے اور کسی ملک کے انسانی اور مادی ذرائع کے مؤثر استعمال کا ذریعہ۔ کسی قوم کو ڈسپلن کا عادی بنانا ایک تاریخی عمل ہے جس کے لیے طویل عرصہ درکار ہے۔ ابھی تک کوئی ایسا ٹوٹکا معلوم نہیں ہو سکا کہ جس کو چھو منتر کی طرح پڑھتے ہی کسی قوم کا اعصابی

نظام خود بخود ڈسپلن کی طرف مائل ہو جائے۔

ڈسپلن کا پہلا جز: قانون اور ضابطوں کی پابندی ہے۔ یہ قانون اور ضابطے ان گنت ہیں۔ خدائی قانون، ملکی قانون، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے قواعد۔ سرکاری دفاتر کے فنڈامنٹل رول، محکمانہ کوڈ، کلبوں اور کمیٹیوں کے بائی لاز۔ ان سب کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں جزا و سزا کا عنصر شامل ہے۔ عدم اطاعت کی صورت میں فرد کی آزادی سلب کی جا سکتی ہے۔ اس پر کوئی مالی تعزیر عائد کی جا سکتی ہے۔ اسے کسی ادارے کی رکنیت سے خارج کیا جا سکتا ہے۔ یا انتہائی صورت میں مجرم کو اس کی زندگی سے محروم کیا جا سکتا ہے۔ بعض لوگ صرف سزا سے بچنے کے لیے قانون کی پابندی اختیار کرتے ہیں۔ بعض دوسروں کی دیکھا دیکھی میں قانون پر چلتے رہتے ہیں۔ اس نراجی (ANARCHIST) اقلیت کو چھوڑ کر جو ہر قانون سے بغاوت کرانے کو عین انسانیت سمجھتی ہے، معاشرے کا کوئی گروہ یا طبقہ ایسا نہیں جو قانون اور ضابطوں کی ضرورت کا منکر ہو۔ اگر یہ نہ ہو تو متمدن زندگی کا تصور ساقط ہو جائے۔

آئین کی مقررہ کی ہوئی مدت کے بعد جب ہمارا ضابطۂ قانون تمام تر اسلامی اصولوں کی روشنی میں مرتب کیا جائے گا تو اس سے عام شہریوں کی بہت سی ذہنی الجھنیں دور ہوں گی اور ان میں قانون کے لیے بھرپور اعتماد پیدا ہو گا۔ ایک اور اہم بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ قوانین کا مجموعہ عام فہم زبان میں تیار کیا جائے۔ علم سیاسیات کے ماہرین نے وقتاً فوقتاً بجا طور پر اس امر کی شکایت کی ہے کہ قانون کے مجموعے ایسی عجیب و غریب زبان میں ڈھالے جاتے ہیں جو پڑھے لکھے شہریوں کی سمجھ میں بھی نہیں آ سکتی۔ مختصر اور عام فہم قوانین کے بغیر جمہوریت کا تصور بھی نامکمل ہے۔ قاعدہ ہے کہ عدالت کسی ملزم کو شک کا فائدہ دیتے ہوئے تو بری کر سکتی ہے لیکن اس کی طرف سے قانون کی لاعلمی کا عذر سننے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قانون کی پیچیدگیاں دور کی جائیں، اسے ان اصولوں کے تابع کیا جائے جو لوگوں کی روحانی اور ثقافتی قدروں سے ہم آہنگ ہوں اور ایسی زبان میں پیش کیا جائے جس کے مطالب معمولی تعلیم یافتہ شہریوں کی گرفت سے باہر نہ ہوں۔ قانون اور ضابطے کو ماننا ضروری ہے۔ اگر قانون شکن اور ضابطہ شکن عناصر کو کھلی چھٹی دے دی جائے تو معاشرے کے سارے بند ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ بلکہ سارے کا سارا قانونی ڈھانچہ عدم احترام کا شکار ہو جاتا ہے اور نراج (ANARCHY) کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ ڈسپلن نہ ہو گا تو معاشرے میں، عدم تحفظ ایک

لاعلاج بیماری بن جائے گی۔ اس غیر یقینی دور میں سب سے زیادہ محفوظ قومیں وہ ہیں جو منظم زندگی بسر کرنے کی عادی ہو چکی ہیں۔

ڈسپلن انسانی ذہن کی ایک داخلی کیفیت بھی ہے جو تعلیم و تربیت سے وجود میں آتی ہے۔ اس کے دو عنصر ہیں۔ پہلا انسانی مساوات کا احساس اور دوسرا معاشرے کے مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینے کا جذبہ۔ دونوں میں ایک گہرا رابطہ ہے۔ مساوات کا تصور انسانی ہمدردی کا منبع ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ طالب علم، طالب علموں کی، مزدور، مزدوروں کی، سرمایہ دار سرمایہ داروں کی، ملازم ملازموں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ یہ ہمدردی مساوات سے پیدا ہوتی ہے۔ جو معاشرہ عدم مساوات کے مسلک پر کاربند ہو، اس کے اکثر افراد انسانی ہمدردی کی صفت سے محروم ہوتے ہیں۔ انسانی ہمدردی کے جذبے کے ماتحت بظاہر چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی عظیم سے عظیم کارنامے انجام دے سکتا ہے۔ اپنے گراں قدر ذاتی مفاد کو پس پشت ڈال کر قومی مفاد کی حفاظت پر کمر بستہ ہو جانا بھی ڈسپلن کا ایک رُخ ہے۔ کیوں کہ ڈسپلن بے نفسی کا تقاضا کرتا ہے، ایسی بے نفسی کہ انسان دوسروں کی خاطر اپنے آرام اور اپنے متاع کو قربان کر دے۔ ماہرین تعلیم کا فرض ہے کہ وہ ایسی تعلیم مہیا کریں اور اہل سیاست کا فرض ہے کہ وہ ایسا ماحول پیدا کریں جس میں یہ ذہنیت پروان چڑھے۔ ضابطوں کی پابندی اور قانون کا احترام معاشرے کے ہر فرد، ہر گروہ اور ہر طبقے کے لیے ضروری ہے۔

حقِ ملکیت سیاسیات کا ایک اہم بالشان مسئلہ ہے۔ ابتدائی معاشروں میں یہ حق یا تو بالکل معدوم تھا یا بہت محدود۔ صدیوں تک ہماری دیہی زندگی اسی ڈگر پر چلتی رہی ہے۔ افلاطون نے اپنی ری پبلک کی بنیاد اشتمالیت کی سکیم پر رکھی تھی۔ ارسطو نے اپنے استاد کی تجاویز پر سخت نکتہ چینی کی لیکن اس بات کو تسلیم کر لیا کہ "Friends' goods are held in common" بعد کے ادوار میں حقِ ملکیت ہمیشہ ایک نزاعی مسئلہ رہا ہے۔ وقتاً فوقتاً حکومتوں نے افراد کی کمائی کے ذریعوں اور خرچ کی مدوں پر قانونی پابندیاں لگائی ہیں۔ کسی شخص کو یہ اجازت نہیں دی کہ وہ جس طرح چاہے روپیہ کمائے اور جس طرح چاہے خرچ کرے۔ اس کے باوجود دولت و ثروت کے مالکوں کو ہر معاشرے میں امتیاز و اقتدار حاصل رہا ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد دنیا کا نقشہ بدلا تو صنعتی اور نیم صنعتی ملکوں میں سرمایہ داروں اور سرمایہ کاروں کی سرداری قائم ہوئی۔ اس مختصر سی اقلیت نے اتنا زور پکڑا کہ اس سے پہلے کی انسا

تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ سوشلزم کے فلسفہ کی بنیاد "خواجہ ناکردہ کار" کی چیرہ دستی پر رکھی گئی تھی۔ اس کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ ہر سرمایہ دار معاشرے کے اخلاق و عادات، رسوم و قوانین سرمایہ دار اور اس کے سرمائے کی حفاظت کے لیے وجود میں آتے ہیں۔ یہ بات کسی حد تک درست ہے۔ ہر عصر معاشروں کے قانونی ضابطے اسی ڈھب پر بنائے گئے ہیں۔ مثلاً انگریز کی چھوڑی ہوئی تعزیرات میں عادی مجرم کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ بار بار چوری، رہزنی، ڈاکہ یا ایسے جرائم کا مرتکب ہوتا رہا ہو جن کی زد دوسرے افراد کے حقِ ملکیت پر پڑتی رہی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس ضابطے نے اخلاقی جرائم کو اس حد تک بھیانک نہیں گردانا، جتنا دوسروں کی املاک پر ہاتھ ڈالنے کے فعل کو۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ صاحب ثروت طبقے کو معاشرے کے ہر محاذ پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ اس جماعت کا کوئی فرد کسی دفتر میں جائے۔ اہلِ کار کا دروازہ کھٹکھٹائے یا اپنے مال و جان کی حفاظت کے لیے دوڑ دھوپ کرے۔ عام طور پر اس کی دست گیری کی جاتی ہے۔ ستمبر ۱۹۳۶ء میں جب میں سرکاری ملازمت میں داخل ہوا تو محکمہ تعلیم کے ایک تازہ سرکلر کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اس میں اس بات پر اظہارِ افسوس کیا گیا تھا کہ بہت سے کالج موسم گرما کی تعطیلات کی تاریخوں کا تعین کرتے وقت من مانی کرتے ہیں۔ ایک مختصر سے وعظ کے بعد یہ ہدایت کی گئی تھی کہ گرمائی چھٹیوں کی تاریخیں مقرر کرنے میں ان والدین کی سہولت کا خاص طور پر خیال رکھا جائے، جو ستمبر کا مہینہ گزارنے کے لیے پہاڑوں پر جاتے ہیں۔ وہ والدین ہوں گے کتنے؟ غالباً تعداد میں ایک فی صد سے بھی بہت کم۔

صاحب ثروت طبقے کے جس تفوق کی مثالیں ابھی دی گئی ہیں۔ ہمارے معاشرے نے بعض بیرونی اثرات کے ماتحت قبول تو کر لیا ہے لیکن ہماری روایت مخالف سمت میں جاتی ہے۔ کوئی پرانے زمانے کی بات نہیں۔ اب بھی کسی شہر کے گلی کوچوں میں جایئے، بہت سے مکانوں کے ماتھوں پر آپ "ھٰذا من فضل ربی" لکھا ہوا پائیں گے۔ اگرچہ ان الفاظ کو بہت مضحکہ خیز معنی پہنا دیے گئے ہیں۔ ان کا اصل مطلب یہی ہے کہ حصول دولت کسی شخص کا ذاتی کمال نہیں بلکہ ہر صاحبِ حیثیت آدمی کی دولت معاشرے کی ضروریات اور قانون سے پیدا ہوتی ہے۔ جب ہم کسی نئے مکان میں بسنے کے لیے جاتے ہیں تو سب سے پہلے جو چیز وہاں پہنچائی جاتی ہے، وہ کپڑوں کے بھرے ہوئے سوٹ کیس اور نیلامات

کے صندوقچے نہیں ہوتے بلکہ قرآنِ حکیم کا ایک نسخہ ہوتا ہے۔ بظاہر یہ ایک چھوٹی سی بات ہے لیکن دولت کے اسلامی تصور کے متعلق اس میں ایک جہان معنی آباد ہے۔ اسی طرح اب تو یہ بات کم کم نظر آتی ہے لیکن میرے دیکھنے کی بات ہے کہ بہت سے مکانوں کی پیشانی پر یہ شعر کندہ نظر آتا تھا:

در حقیقت مالک ہر شے خدا است　　این امانت چند روزہ پیش ما ست

اسلام کی اس تعلیم کو اقبال نے ان الفاظ میں ادا کیا تھا:

منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امین۔

دولت مقصود بالذات نہیں۔ یہ اس ہتھیار کی طرح ہے جس کے استعمال کے نتائج، استعمال کرنے والے کے فہم و فراست اور اس کی نیت پر منحصر ہیں۔ کسی انسان کی سیرت کا اندازہ نہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی کمائی کے ذرائع کیا ہیں۔ بلکہ اس کی شخصیت کا بہتر اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی حاصل کی ہوئی دولت کو کن کن مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتا ہے۔ "کسبِ حلال" ہماری ثقافت کا ایک زرین تصور ہے۔ فضول خرچی اور اسراف سے پرہیز کی ہدایت بھی اتنی ہی واضح ہے۔ آدمی کتنا کچھ اپنے پاس رکھے اور کتنا دوسروں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے خرچ کرے، اس کے متعلق بھی خدائی احکام میں کوئی ابہام نہیں۔ زیادہ تفصیلات کا موقع نہیں۔ اس قسم کا نظام مملکت کی نگرانی میں ہی قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے موجودہ حالات میں بہت سی تدقیق اور کاوش کی ضرورت ہوگی۔ جائداد کی نت نئی قسمیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اسراف، بخل اور بددیانتی کے اچھوتے طریقے ایجاد ہوتے رہیں گے۔ موجودہ عالمی نظامِ زر کی تمام کلیں نہ صرف اونٹ کے الف کی طرح ٹیڑھی ہیں بلکہ غریب ملکوں کا خون ان کے لیے متواتر گریز (...) کا کام دیتا ہے۔ اس صورتِ حال میں اصول یہ ہے کہ مملکت یا اہلِ سیاست اس باب میں لاتعلقی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔ ملک کی اقتصادی حالت کوئی ڈایا گراموں اور گرافوں کا مسئلہ نہیں۔ درآمد اور برآمد محض اس لیے نہیں کہ ان سے ہمارے زرمبادلہ کے ذخیروں میں کتنا اضافہ ہوتا ہے۔ پیداوار صرف اس لیے نہیں بڑھائی جاتی کہ ہماری بنیادی ضروریات پوری ہوتی رہیں بلکہ بالآخر یہ سب شرف انسانی کے تحفظ کا ذریعہ ہیں۔ ۱۹۷۳ء کے دستور نے واضح طور پر حق ملکیت پر پابندیاں لگائی ہیں۔ یہ ایک خوش آئند آغاز ہے۔ مملکت کے پاس اس بات کے سوائے اور کوئی چارہ نہیں کہ غیر معقول معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے

کے لیے اپنے تمام ذرائع بروئے کار لائے۔ معاشی ناہمواریوں کی موجودگی میں نہ تو عدل کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں اور نہ ہی انسان کو اس کی کھوئی انسانیت لوٹائی جا سکتی ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ جب سیاست میں زر کا استعمال ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے تو اس سے بے اندازہ قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔ سیاست بکاؤ مال کے ہاتھ میں آتی ہے تو معاشرے کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ صاف ستھری سیاست کا تقاضا یہ ہے کہ سیاسی نوعیت کے اسراف پر شدید سے شدید پابندیاں عاید کی جائیں۔

سیاست کا ایک اور اخلاقی ضابطہ بھی قابلِ غور ہے۔ ایک دوسرے درجے کے امریکن سکالر نے اسے "پری ڈکٹے بلیٹی" (Predictability) کا نام دیا ہے۔ میرے خیال میں انگریزی لفظ "سٹے بلٹی" (Stability)۔ اور ہماری اپنی زبان میں استحکام کا لفظ اسی مفہوم کو بہتر طور پر ادا کرتا ہے۔ ہم جس برق رفتار دور سے گزر رہے ہیں، اس میں نت نئی علمی اور سائنسی ترقیوں کے کرشموں سے حالات لحظہ بہ لحظہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اس ماحول میں معاشرتی تبدیلیاں ناگزیر ہو جاتی ہیں۔ عوام کی صدیوں پرانی عادتیں، رسم و رواج، قانون اور اخلاق سب ان تبدیلیوں کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ ابدی اور وقتی قدروں میں تمیز مشکل ہو جاتی ہے، اور معاشرہ ایک لگاتار بحرانی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ افراد میں ایک گھٹیا درجے کی انا اور انفرادیت آجاتی ہے جو معاشرے کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتی ہے۔ ایسا معاشرہ اس کشتی کی طرح ہے جس کے مسافر طوفان کی شدت سے نہیں بلکہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھنے سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اس افراتفری سے اعلیٰ قدروں کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ انسان بتدریج ان صفات کو کھوتا چلا جاتا ہے جو شرفِ انسانی کا امتیاز ہیں۔ اس سلسلے میں مملکت اور اہلِ سیاست پر ایک بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ معاشرے کو استحکام اور توازن بخشنا ان کا کام ہے۔ عوام دل جمعی سے اپنے فرائض اسی صورت میں انجام دیں گے جب ان کو اس بات کا یقین ہو کہ کل پرسوں، بلکہ تین، چار اور آٹھ دس سال میں حالات تبدیل تو ہوں گے لیکن اتنے نہیں کہ ان کا سب کیا کرایا اکارت چلا جائے۔ علمی میدان میں تحقیق و تدقیق، اقتصادی شعبے میں منصوبہ بندی، صنعتی میدان میں بتدریج پیش قدمی، اعلیٰ اخلاقی قدروں کی پابندی۔ یہ سب کچھ اسی امید پر کیا جاتا ہے کہ معاشرہ اقتصادی اور سیاسی طور پر مستحکم رہے گا۔ اگر مستقبل کی طرف سے بے یقینی ہو تو لوگ سب اصول اور سارے کام چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ جائیں گے۔

معاشرہ بتدریج انتشار کا شکار رہتا چلا جائے گا اور کسی وقت اپنا تشخص کھو بیٹھے گا۔ مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ان چند اوصاف کا ذکر بھی ضروری ہے جو سیاسی راہنماؤں کے لیے لازمی ہیں۔ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ مملکت کا بنیادی فرض شرف انسانی کی حفاظت ہے۔ اپنے فرائض کی انجام دہی میں مملکت، رائے عامہ اور شہریوں کے منظم گروہوں کی محتاج ہوتی ہے۔ سیاسی پارٹیوں کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ مملکت کو اپنے فرائض قرینے سے انجام دینے میں مدد دیں۔ سیاسی پارٹیاں عام طور پر نکتہ چینی کا ہدف بنتی رہتی ہیں۔ لیکن اپنی تمام خامیوں کے باوصف ان کا وجود نہایت ضروری ہے۔ اینگلو سیکسن لوگوں کے نزدیک سیاست ایک کھیل ہے جس کو وہ گیم آف پالٹکس کہتے ہیں۔ لیکن اگر یہ کھیل ہی ہے تو انتہائی طور پر ذمہ داری کا۔ اس کھیل کے میدان میں طالع آزماؤں کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ کھیل وہی لوگ کامیابی کے ساتھ کھیل سکتے ہیں جن میں خدا ترسی اور خلق خدا سے محبت کے جذبات ہوں۔ جن کی دیانت شک و شبہ سے بالا ہو اور جو غیر معمولی فہم و ذکا کے مالک ہوں۔ جو گہرا تاریخی شعور رکھتے ہوں اور جن کو اپنے ملک کے مستقبل پر پورا پورا اعتماد ہو۔ لیڈر نہ صرف موجودہ حالات پر نظر رکھتا ہے۔ بلکہ وہ مستقبل کے لیے بھی اتنا ہی فکرمند ہوتا ہے جتنا حال کے لیے۔ وہ چند عارضی فوائد کی خاطر آنے والی نسلوں کے مفادات کو قربان نہیں کرتا۔ لیڈر کے لیے یہ تو ضروری نہیں کہ وہ اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں رکھتا ہو، لیکن یہ بات لازمی ہے کہ وہ اعلیٰ پائے کی ذہنی صلاحیت رکھتا ہو۔ عالمی سیاست پر اس کی گہری نظر ہو۔ انسانی فطرت کی گہرائیوں اور باریکیوں سے واقف ہو۔ لیڈر عوام کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے، اس لیے وہ ان میں بہت جلد گھل مل جاتا ہے۔ لیکن جو لیڈر عوام سے کسی قدر فاصلے پر رہتے ہوئے بھی کوہ وقار ہوتے ہیں ان میں فطانت اور دیانت کی ایسی خوبیاں ہوتی ہیں کہ لوگ ان کو ہر حال میں آنکھوں پر بٹھلاتے ہیں۔ لیڈر میں زبردست قوت فیصلہ ہوتی ہے۔ جو شخص اہم معاملات کو طے کرنے میں تذبذب اور تساہل کا اظہار کرتا ہے، وہ یقیناً لیڈر کا اہل نہیں۔

لیڈر عوام کی رہنمائی کرتا ہے۔ اگر وہ دیانت داری کے ساتھ سمجھتا ہے کہ رائے عامہ غلطی پر ہے تو وہ رائے عامہ کے خلاف جنگ کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ ایفائے عہد اور راست گوئی کے اوصاف قیادت کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ باصلاحیت رہنما کبھی خطرے کی پروا نہیں کرتا۔ وہ

بے خطر آتش نمرود میں کود پڑتا ہے۔ وہ مشکلات کے بھنور میں اپنے اور اپنے ملک کے لیے نئی راہیں نکالتا ہے۔ قوم کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو سہارا دیتا ہے۔ اقبال کے الفاظ میں اپنے "سود" کو "جیب زیاں" سے بڑا کرتا ہے۔ لیڈر میں اپنے خیالات لوگوں تک پہنچانے اور اپنی بات منوانے کی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے، اس لیے وہ بہت اچھا مقرر بھی ہوتا ہے۔ اس کی گفتگو میں عزم، یقین اور استدلال کے جوہر ہوتے ہیں۔ اس کی کہی ہوئی بات سننے والے کے دل میں اتر جاتی ہے اور ان میں جذبۂ عمل پیدا کرتی ہے۔ آزادی سے پہلے کے رہنماؤں میں سر سید احمد خان اور قائد اعظم کی شخصیتوں پر یہی رہنمائی کی قبا راست آتی تھی۔

مضمون یہیں پر ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن ظلم ہوگا کہ رہنماؤں کے بیان کے بعد تعلیم یافتہ عوام کے ضابطۂ اخلاق کے متعلق کوئی بات نہ کہی جائے۔ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے اکبر نے لکھا تھا:

اس دور میں یہی ہے اب داخل نکوئی — مذہب ہے نکتہ چینی، ملت کی عیب جوئی

حالی نے بھی اپنے مخصوص دھیمے انداز میں اس رجحان پر تبصرہ کیا تھا۔ اس سے چند سو سال پہلے امام غزالی نے اپنی ایک تصنیف میں "غیبت" پر ایک مستقل باب قائم کیا تھا اور کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس مشغلے کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی تھی۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پرگوئی اور نکتہ چینی صدیوں سے ہماری قومی ہابی (hobby) چلی آ رہی ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ بے کار اور بے سر و پا گفتگو میں جو لذت ہے وہ سنجیدہ گفتاری سے حاصل نہیں ہوتی۔ چائے کی میز پر بیٹھے بیٹھے ہم نہایت آسانی سے ہر شخص، بالخصوص اہل سیاست کی فہرست مرتب کر سکتے ہیں، ان کی غیر حاضری میں اور ان کے علم کے بغیر ان کی بہتری کے لیے بہت سے قیمتی مشورے بھی تصنیف کر سکتے ہیں۔ یہ بات ثابت کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی کہ ہمارے اور ہمارے ممدوحوں کے علاوہ دنیا کے سب انسان خطا و نسیان کے پتلے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اس طرز عمل سے ہمارا جذبۂ عمل لذت گفتار کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں آپ کے ذہن میں ہوں گی۔ لیکن ایک ذاتی واقعہ پر بات کو ختم کرتا ہوں۔ ملازمت کے دوران میرے ایک سینئر مجھ سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ ان کے سامنے میں آزادیٔ گفتار کا حق بے دریغ استعمال کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ انھوں نے مجھے ان الفاظ میں ٹوکا:

"Never criticise a people unless you have something better to offer."

اس مختصر نصیحت نے میری زبان پر ہمیشہ کے لیے بہت سی پابندیاں لگا دیں۔